بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ترجمان القرآن کی گزشتہ تین اشاعتوں میں ہم نے معاشرے کے مختلف حلقوں کی خدمت میں چند گزارشات پیش کی تھیں۔ اس مرتبہ ہم پوری قوم سے چند باتیں کہنا چاہتے ہیں اور اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔

یہ بات تو بالکل ناقابلِ تصوّر ہے کہ پاکستان کا کوئی باشندہ اس ملک کو تباہ کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتا ہے۔ چند گنے چنے افراد کو چھوڑ کر، جو ہر قوم میں اپنے ملک سے دانستہ غداری کرنے والے نکل ہی آتے ہیں، اس ملک کے عام لوگ خدا کے فضل سے پاکستان کے دل و جان سے خیر خواہ ہیں اور اسے ایک آزاد خوشحال فلاحی مملکت کی حیثیت سے دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ پاکستان کے مسلمان تو ایک طرف رہے پوری دنیا کے مسلمان اس خطۂ ارضی سے بہت سی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں اور اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار اس خدشے کا اظہار کر چکے ہیں کہ خدانخواستہ اگر یہ ملک برباد ہو گیا تو پوری دنیائے اسلام کو خطرہ لاحق ہو جائے گا جس ملک کی اس قدر اہمیت ہے اس کے باشندوں کو اوّل تو ہر قدم پر، مگر بالخصوص فیصلہ کُن مراحل پر، انتہائی تدبُّر کا ثبوت دینا چاہیے کیونکہ ایک لمحہ کی غفلت اور بے پروائی بڑے سنگین نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

اس ضمن میں پہلی بات جو باشندگانِ ملک کے اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے وہ موجودہ انتخابات کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ ہمارے ملک کے باشندوں کی چونکہ اچھی طرح سیاسی تربیت نہیں ہوئی اس لیے

انتخابات لڑنے والے یہ سمجھ کر میدان میں کودتے ہیں کہ ان میں کامیاب ہوتے ہی وہ حکومت کے ایوانوں میں پہنچ جائیں گے اور وہاں ان کے لیے دنیوی فوائد کا سم سم کھل جائے گا۔ ادھر انتخابات لڑانے والے ماہرین ان مواقع کو غنیمت جان کر اچھی طرح سودے بازی کرتے ہیں اور اپنے ضمیر و ایمان کے نقد دام وصول کرنے کے علاوہ مستقبل کی مراعات کی بھی ضمانت لے لیتے ہیں۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کی عظیم اکثریت ان انتخابات کو محض ہنگامہ آرائی سمجھتی ہے اور ذات برادری کے چکر میں پڑ کر یا چودھراہٹ کے دباؤ میں آ کر، یا طرح طرح کے خوش آئند وعدے سن کر کوئی غلط فیصلہ کر ڈالتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ جو فیصلہ وہ کر رہی ہے، اس کا خمیازہ اسے خود ہی بھگتنا ہی ہوگا۔ اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ عوام کے سامنے انتخابات کی اہمیت اچھی طرح واضح کی جائے۔ انتخابات کا اصل مقصد قوم کو یہ موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کرلے کہ اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے وہ کونسا نہج پسند کرتی ہے اور پھر اس نہج پر زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے کن لوگوں اور جماعتوں پر بھروسہ کرتی ہے۔

جس معاشرے کی عنانِ اختیار کسی مطلق العنان بادشاہ یا آمر کے ہاتھ میں ہوتی ہے اس میں خواہ زندگی کی کتنی حرکت و حرارت موجود ہو مگر وہ معاشرہ ہمیشہ محلاتی سازشوں اور مسلح بغاوتوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ اس معاشرے کے افراد کو کبھی بھی ذہنی اطمینان اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر سوچنے والا دماغ اور ہر حساس دل معاشرے کے حالات سے مختلف انداز سے متاثر ہو کر اپنے ذہن میں قومی فلاح و بہبود کا الگ نقشہ بناتا ہے اور اس بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ وہ اسی کے مطابق ملک کی تعمیرِ نو کرے۔ جن ممالک میں انتخابات کے ذریعے رائے عامہ کو برسرِ اقتدار آنے کی اجازت نہیں دی جاتی وہاں اضطراب کی لہریں اور تبدیلی کی خواہشات مسلح انقلاب کی صورت اختیار کرتی ہیں اور مختلف گروہ اپنے بھائی بندوں کے خون سے ہولی کھیل کر مسندِ اقتدار پر متمکن ہوتے ہیں اور جب تک وہ اس پر براجمان رہتے ہیں اس وقت تک وہ اپنے آپ کو آتش فشاں پہاڑ کے دہانے

پر کھڑا محسوس کرتے ہیں۔

کسی انسانی معاشرے کے لیے بھیڑوں کا گلہ بن جانا بالکل ناممکن ہے۔ پھر یہ بات بھی قرینِ قیاس نہیں کہ انسان بالکل جمود کا شکار ہو جائے اور اس کے اندر تبدیلی کی کوئی خواہش سرے سے پیدا ہی نہ ہونے پائے۔ جب یہ دونوں باتیں ناممکنات میں سے ہیں تو کسی معاشرے کے اجتماعی ڈھانچوں میں تغیر اور عنانِ اختیار سنبھالنے والے ہاتھوں میں تبدیلی بھی فطری چیزیں ہیں۔ اگر یہ کام ووٹ کے ذریعے پُرامن طریق سے سرانجام نہ دیئے جائیں تو پھر گولی کے ذریعے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا اہلِ پاکستان پر یہ احسانِ عظیم ہے کہ اُس نے اس قوم کو یہ سنہری موقع فراہم کیا ہے کہ وہ آمریت، استبداد اور فوجی حکمرانی سے نجات حاصل کر کے جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو۔ تاریخ میں اس قسم کے مواقع شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ دنیا کی کوئی بدنصیب قوم جب ایک مرتبہ فوجی آمریت کی گرفت میں آجاتی ہے تو پھر کشت و خون اس کا معمول بن جاتا ہے اور وہ اس لعنت سے کبھی چھٹکارا نہیں پا سکتی۔ اللہ کا یہ خاص احسان ہے کہ ہمارے ہاں نہ تو فوجی انقلاب کی وجہ سے اس ملک کی سرزمین اس کے باشندوں کے خون سے لالہ زار بنی اور نہ یہ استبداد یہاں مستقل قدم جما سکا۔ سابق صدر کچھ اسی طرح کے عزائم لے کر میدان میں اترے تھے اور دس سال کے عرصہ میں انہوں نے مستقل طور پر آمریت کے جھنڈے گاڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر قوم کے اجتماعی ضمیر نے ان کے اس عزم کی تکمیل نہ ہونے دی اور انہیں بالآخر میدان سے ہٹنا پڑا۔ جنرل یحییٰ نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے پہلے ہی دن سے اس امر کا اعلان کر دیا کہ وہ جلد از جلد جمہوریت بحال کرنے کے خواہشمند ہیں۔ چنانچہ اب تک انہوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کے بارے میں دوسری شکایتیں تو کی جا سکتی ہیں مگر یہ شکایت نہیں کی جا سکتی کہ وہ جمہوریت بحال کرنے کے وعدے میں مخلص نہیں ہیں۔ اگر یہ ملک خون خرابے کے بغیر آمریت کی راہ سے ہٹ کر جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو جائے تو یہ قادرِ مطلق کا اس قوم پر بہت بڑا احسان اور فضل ہوگا۔ یہ تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں بلکہ یہ ایسی تبدیلی ہے جس کی پوری تاریخِ انسانی

میں چند مثالیں ہی ملتی ہیں۔

پھر اس ملک کے باشندوں کو ان انتخابات کے بارے میں یہ بھی اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ یہ نظریاتی اعتبار سے بھی فیصلہ کن اہمیت کے حامل ہیں۔ ہمارے سر ندامت سے جھک جاتے ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے اس ملک میں جو اسلام کے نام پر اور اسلام کے لیے بنا ہے، آئندہ انتخابات میں ہمیں از سرِ نو اس طے شدہ امر کو پھر سے طے کرنا ہے کہ اس ملک کی تعمیر اسلام کی اساس پر ہو گی۔ یہ بات تو ہم پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ہی اچھی طرح طے کر چکے تھے، مگر بدقسمتی سے اس ملک میں مختلف طبقے جس قسم کی ریشہ دوانیاں کرتے رہے ہیں ان سے اس اساس کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کئی قسم کے خدشات پیدا ہو گئے ہیں اور چند افراد اس امر کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح ملک کی اس اسلامی اساس کو بدل کر یہاں باہر سے درآمد کردہ ملحدانہ نظریات پھیلائے جائیں اور ان کی عملداری قائم کی جائے۔ اس بنا پر اہلِ پاکستان ان انتخابات میں ایک بہت بڑی آزمائش سے گزرنے والے ہیں۔ انہیں اب نہایت واضح طور پر یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ اسلام کے سوا اس ملک کی کوئی دوسری نظریاتی اساس تسلیم نہیں کرتے اور اس خطۂ پاک کو اسلام اور صرف اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا عزم بالجزم رکھتے ہیں۔ یہ انتخابات اُس مقدس عہد کی تجدید کی حیثیت رکھتے ہیں جو برِصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں نے پاکستان کا مطلب و مقصد بیان کرتے ہوئے خدا اور خلق کے سامنے باندھا تھا۔ ان انتخابات کے ذریعے انہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اپنے عہد پر بدستور قائم ہیں۔ یہ انتخابات اس مرحلہ پر فی الحقیقت الحاد اور اسلام کے مابین استصواب ہیں کیونکہ ملّت کو قطعی طور پر اس امر کا فیصلہ کرنا ہے کہ وہ اسلام کے سوا ہر دوسری چیز کو باطل سمجھتی ہے اور اس بنا پر اس خطۂ پاک میں کوئی غیر اسلامی نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس ملک کی عظیم اکثریت نے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح محسوس کرتے ہوئے انتخابات میں غیر اسلامی عناصر اور قوتوں کو شکستِ فاش دے دی تو پھر الحاد کو کسی صورت میں بھی سر اٹھانے کا موقع نہ ملے گا۔ لیکن اگر اس نے ان انتخابات کو محض ہنگامہ آرائی

کا شغلہ سمجھ کر اس میں غیر سنجیدگی اور عدم تدبّر کا مظاہرہ کیا تو پھر کفر و الحاد جری ہو جائے گا اور اس میں یہ حوصلہ پیدا ہو گا کہ جو کام وہ اسمبلیوں میں گھس کر انجام نہیں دے سکا اُسے اپنی قوت کے بل بوتے پر غیر آئینی طریقوں سے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

ہر پاکستانی کو ووٹ دیتے وقت سب سے پہلے اپنے ضمیر سے یہ پوچھنا چاہیے کہ اسلام کے معاملے میں کونسی جماعت سب سے زیادہ مخلص ہے اور کون اس بات کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اجتماعی زندگی کا کوئی ایسا جامع نقشہ بنا سکے جو اسلامی نظام کا ہر اعتبار سے مظہر بھی ہو اور جس کے مطابق دورِ جدید میں زندگی کی عملاً تعمیر بھی کی جا سکتی ہو۔

اخلاص اگرچہ انسان کی داخلی کیفیت کا نام ہے جسے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا، لیکن کوئی شخص ہو یا جماعت۔ اس کی زندگی میں بہرحال ایسی علامات ضرور ظاہر ہوتی ہیں جن سے لوگ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے قول میں مخلص ہے یا نہیں۔ اخلاص کی پرکھ دو باتوں سے کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ انسان جن افکار و نظریات کا علمبردار ہے اس کی عملی زندگی میں ان کی جھلک موجود ہو۔ دوسرے اُن افکار و نظریات کے ساتھ اس کی وابستگی دیرپا ہو اور تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہو کہ کوئی تحریص و تخویف اُسے اپنے مسلک سے نہیں ہٹا سکی ہے۔

بعض لوگ بڑے اضطراب کے عالم میں یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ اس ملک کی ہر جماعت اسلامی نظام کے قیام کی دعویدار ہے آخر ہم کس طرح یہ فیصلہ کریں کہ کون اس دعوے میں مخلص ہے۔ یہ اعتراض بڑا سطحی اور یہ اضطراب بڑا بے معنی ہے۔ ذاتی زندگی میں ہمارے پاس کئی لوگ مختلف دعوے لے کر آتے ہیں، مگر محض دعوے کی بنیاد پر ہم ان پر بھروسا نہیں کرتے، بلکہ یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ شخص اپنے دعوے میں کس حد تک کھرا اور سچا ہے۔ اگر ذاتی زندگی میں یہ پرکھ مشکل نہیں تو قومی معاملات میں ہمارے لیے کیسے موجب پریشانی

بن سکتی ہے۔ کسی جماعت کا اخلاص تو بآسانی پرکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ایک فرد کی حیثیت سے تو انسان اپنے آپ کو کچھ مدت تک اور کسی حد تک چھپا سکتا ہے مگر کوئی جماعت جو ہزاروں افراد پر مشتمل ہوتی ہے، جس کا دائرہ کار بڑا وسیع ہوتا ہے، اور جس کے افکار و اعمال صبح و شام لاکھوں انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، وہ آخر دلوں کے کھوٹ اور نیتوں کے فساد کو کس طرح عرصہ دراز تک اخفا میں رکھ سکتی ہے؟ اجتماعی زندگی کی نفسیات یہی ہے کہ قول اور عمل میں تضاد اختیار کرنے کے ساتھ ہی اندر کے سارے بھید خود بخود باہر آجاتے ہیں۔ اسی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اجتماعی جدوجہد کے جھٹکے اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ جو کچھ بھی اس جماعت کے اندر ہوتا ہے وہ فوراً باہر آجاتا ہے۔ دوسرے کسی جماعت کے تمام افراد اتنے عیار اور چالاک نہیں ہوتے کہ وہ سب مل کر اپنی نیت کے فساد کو اجتماعی طور پر چھپا سکیں۔ اب کسی جماعت کے دعوائے اسلام کو پرکھنے کے لیے چند باتوں کو اگر نگاہ میں رکھا جائے تو حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے۔

جو جماعتیں اسلام کا نام لیتی ہیں ان کے ماضی پر نگاہ ڈالی جائے۔ خصوصاً اگر انہیں کبھی اختیارات کی باگیں سونپی گئی ہوں تو اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ انہوں نے اُس وقت اپنے اختیارات سے دین کو نافذ کرنے کے لیے کیا کچھ کیا ہے؟ جس طرح کسی فرد کے کردار کا صحیح اندازہ اس کی باتوں سے نہیں بلکہ اس کے عمل سے کیا جاتا ہے اسی طرح کسی جماعت کے کردار اور اخلاص کا اندازہ اس کے زبانی دعووں سے نہیں بلکہ اُس کے اُس دَور کے طرزِ عمل سے کیا جاتا ہے جب وہ صاحبِ اختیار تھی۔ اگر اسی ایک معیار کو سامنے رکھ لیا جائے تو اصل صورت کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

باقی رہیں وہ جماعتیں جنہیں ابھی تک تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کا موقع نہیں ملا ہے ان کے بارے میں بھی کسی نتیجے پر پہنچنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے بالکل اسی طرح جماعتیں اپنے ارکان اور حامیوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ جماعت کا مزاج لازمی طور پر اس کے کارکنوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسی مزاج کو دیکھ کر ان کے دعوائے اسلام کو بآسانی پرکھا جاسکتا ہے۔

جن لوگوں کے افکار و اعمال، جن کی انفرادی زندگیاں اور جن کی اجتماعی سرگرمیاں سب اسلام کی ضد ہوں ان کی اسلام سے وابستگی کے دعوے کو کوئی فاتر العقل ہی تسلیم کر سکتا ہے۔

کسی جماعت کے اخلاص فی الاسلام کو جانچنے کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا اس میں فی الواقع یہ صلاحیت بھی موجود ہے یا نہیں کہ وہ موجودہ دور کی ایک جدید ریاست کو اسلامی احکام و تعلیمات کے مطابق چلا سکے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ اس جماعت میں اسلامی علوم اور جدید علوم، دونوں کے جاننے والے اچھی خاصی تعداد میں موجود ہوں تاکہ حالات کو صحیح طور پر سمجھ کر اسلامی تعلیمات کا انطباق کیا جا سکے۔ جس طرح محض جدید علوم کے ماہرین اسلام کو نافذ نہیں کر سکتے اسی طرح صرف قدیم علوم کے ماہرین بھی اس فرض کو کماحقہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ اسلام سے گہری واقفیت اور دورِ جدید کے افکار و رجحانات اور احوال و ضروریات سے شناسائی، یہ دونوں چیزیں یکساں ضروری ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ملک کی تمام جماعتوں کا جائزہ لے کر دیکھیے کہ انہوں نے علمی میدان میں کیا کام کیا ہے اور ان میں کونسی جماعت ایسی ہے جس نے زندگی کے ہر گوشے اور نظامِ حکومت، نظامِ معیشت، نظامِ تعلیم، اور نظامِ تہذیب و تمدن کے ہر پہلو کے متعلق اسلامی تعلیمات کا ایک ایسا واضح نقشہ لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے جو نئی تعلیم یافتہ نسل کو اس بات پر مطمئن کر سکے کہ فی الواقع اِس دور میں ایک جدید ریاست اسلامی اصولوں پر چلائی جا سکتی ہے، اور اس کے ساتھ اس نے موجودہ زمانے کے افکار و رجحانات کی غلط رعایت کر کے اسلامی احکام و تعلیمات میں قطعاً کوئی معذرت خواہانہ تغیّر و تبدل نہیں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دینی طبقوں میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو نہ خود یہ ضرورت پوری کرنے کی قابلیت رکھتا ہے اور نہ دوسرے کو یہ کام کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ شب و روز اس کام میں کیڑے ڈالنے اور طرح طرح کے اتہامات لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن ملک اہلِ علم اور اہلِ نظر اور بے غرض دینداروں سے خالی نہیں ہے۔ وہ دیکھ سکتے ہیں کہ یہ خدمت اس ملک کی کس جماعت نے انجام دی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس جماعت نے اس نوعیت کا کوئی کام سرانجام نہیں دیا